محمد بلال

حیات امین احسن

(۱۱)

باب ۱۱

گاؤں میں منتقل ہونے کا مسئلہ

امین احسن لاہور میں ایک کرایے کی کوٹھی میں اقامت پذیر تھے۔ دوسرے اخراجات بھی بہت زیادہ تھے۔ شہری زندگی کے رکھ رکھاؤ پر بھی بہت زیادہ خرچ کرنا پڑتا تھا۔ بڑے بیٹے ابو صالح کی وفات سے گھر کی مالی ذمہ داریاں بھی ان کے ناتواں کندھوں پر آن پڑی تھیں۔ پھر ان کی بیماری کے اخراجات نے انھیں خاصا مقروض کر دیا تھا۔ ان کی معاشی حالت پہلے بھی مستحکم نہ تھی۔ پھر وہ معاش کو اہمیت دینے کے بالکل قائل نہیں تھے۔ قرآن مجید کی رو سے ان کا ایمان تھا کہ آدمی کو فکر صرف اپنا فرض ادا کرنے کی ہونی چاہیے۔ اگر وہ اخلاص کے ساتھ اس میں منہمک ہو گا تو اللہ تعالیٰ اس کی کفالت کی ایسی راہیں خود کھول دے گا جو اس کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوں گی۔ اگر اس راہ میں کچھ آزمایشیں پیش آتی ہیں تو ان کا مقصد انسان کی تربیت کرنا ہوتا ہے۔

امین احسن کی دوسری اہلیہ محترمہ کے والد چودھری عبدالرحمٰن جالندھر کے قریب ایک گاؤں راہوں کے ایک بڑے زمین دار تھے۔ تقسیم ہند کے بعد چودھری صاحب کو بدلے میں مختلف مقامات پر زمین الاٹ کی گئی۔ امین احسن کی گزر اوقات اس زمین کی پیداوار سے ہوتی تھی جو ان کی اہلیہ کے حصے میں آئی تھی، مگر اس کی آمدنی بھی اخراجات کی مقابلے میں کم تھی۔ امین احسن کے عزیز دوست سردار محمد اجمل خان لغاری نے یہ زمین

اشتمال اراضی کے ذریعے سے یکجا کرا دی تو اس کا انتظام آسان ہو گیا۔ پہلے زمین پر کاشت اور پیداوار پر ذاتی توجہ نہ ہوتی۔ یہ معاملات منشی کی زیر نگرانی ہوتے، جس کی وجہ سے یافت کم رہتی۔ اس کے باوجود امین احسن نے کہا کہ لاہور میں گزارا نہیں ہوتا، لہٰذا گھر پر غور ہوا کہ کیوں نہ اسی زمین پر رہایش اختیار کر لی جائے، مگر امین احسن سوچتے تھے کہ اس منتقلی سے ایک تو لاہور میں قرآن کی تدریس کا کام بالکل معطل ہو جائے گا، اور دوسرے یہ کہ وہ اہلیہ کی زمین پر انحصار کر کے اپنی ذمہ داری بیگم صاحبہ کو منتقل کرنے والے کہلائیں گے۔ وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے۔ شیخ سلطان احمد سے مشورہ کیا۔ انھوں نے کہا کہ یہ آپ کا ذاتی اور خانگی معاملہ ہے، اس کا فیصلہ حالات کے لحاظ سے ہونا چاہیے۔ امین احسن کا خیال تھا کہ اس طرح میں نان و نفقہ کی ذمہ داری اپنی اہلیہ کے اوپر ڈالنے والا بن جاؤں گا۔ شیخ سلطان صاحب نے اس کے خلاف دلیل دیتے ہوئے کہا کہ آپ وہاں فارغ تو نہیں بیٹھیں گے۔ آپ زمین داری کے تمام معاملات خود سنبھالیں گے۔ اس طرح منشیوں کے تقرر کی ضرورت نہیں رہے گی۔ کاشت کی منصوبہ بندی اور نگرانی آپ خود کریں گے۔ اس میں آپ کا وقت اور محنت صرف ہو گی۔ آپ اس کا معاوضہ پانے کے حق دار ہوں گے۔ پھر زمین سے جو یافت ہو گی، اس میں آپ کا ذاتی حصہ اچھا خاصا ہو گا۔ یوں آپ اہلیہ سے نان و نفقہ پانے کے الزام سے بری ہوں گے۔ یہ دلائل سننے کے بعد امین احسن مطمئن ہو گئے۔

زندگی کے اس موڑ پر امین احسن کیسے حالات سے دوچار تھے، ان کے خطوط سے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ لاہور سے ۲۳/ دسمبر ۱۹۶۰ء کو سردار محمد اجمل خان لغاری صاحب کے نام لکھتے ہیں:

> ”عنایت نامہ موصول ہوا۔ میں نے یہ فیصلہ تو اس وجہ سے کیا ہے کہ اب اس کے سوا کوئی شکل باعزت گزارے کی نظر نہیں آئی۔ اور یہ بھی ابھی اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ زمین پر سر چھپانے کے لئے کوئی جھونپڑا بن جائے۔ آج کل میں اسی چکر میں ہوں۔ دعا کیجئے کہ میرا یہ ارادہ پورا ہو مجھے توقع ہے کہ محمود صاحب (مولانا کے برادر نسبتی فضل الرحمٰن محمود صاحب مراد ہیں اس وقت تک مولانا کی اہلیہ کی زمین ان کے ساتھ مشترک تھی۔ مدیر) نے زمین اگر بغیر کسی جھگڑے کے علیحدہ کر دی تو میں دوسری مشکلات پر قابو پا لوں گا، مجھے اپنی زندگی کے اس موڑ پر جو میں بڑھاپے میں کرنے پر مجبور ہوا ہوں اللہ تعالیٰ کے بعد سب سے زیادہ سہارا پانے کی جس سے توقع ہے وہ آپ ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ اپنے مشوروں سے میرا حوصلہ بڑھاتے رہیں گے۔“ (سہ ماہی تدبر، جولائی ۱۹۹۸ء، ص ۷۸)

لاہور سے ۲۲؍اگست ۱۹۶۷ء کو بنام محمود احمد لودھی صاحب لکھا:

''اب میں اکتوبر تک لاہور چھوڑ کر رقبے پر منتقل ہونے کی اسکیم بنا رہا ہوں۔ پیش نظر مصارف کی تخفیف ہے۔ ابھی یہ ارادہ چند دوستوں تک راز ہے اور وہ بھی اس پر مطمئن نہیں ہیں لیکن میں اس کو ذاتی پہلو سے مفید بلکہ ضروری سمجھتا ہوں۔ توقع ہے کہ اس سے مصارف میں تخفیف ہو گی۔ قرض میں اضافے کا سلسلہ رک جائے گا اور ادائے قرض کے لئے کچھ پس انداز ہو سکے گا۔ علمی اور تعلیمی مقاصد ضرور متاثر ہوں گے لیکن تفسیر کا کام امید ہے جاری رہ سکے گا۔ اب اس عمر میں ذہنی سکون ضروری ہے جو بحالتِ موجودہ میسر نہیں۔ لاہور اچھی جگہ ہے مگر میرے جیسے شخص کے لئے اس کا رکھ رکھاؤ گراں بلکہ ناقابل برداشت ہے۔''

(سہ ماہی تدبر، جولائی ۱۹۹۸ء، ص ۱۳)

لاہور سے ۲۰؍جون ۱۹۶۳ء کو سردار محمد اجمل خان لغاری کے نام بیان کرتے ہیں:

''آپ مجھے دیہات اور دیہاتی زندگی سے نہ ڈرائیے میں نے اپنی عمر کا بڑا حصہ خالص دیہات میں بسر کیا ہے اور بڑی غریبانہ زندگی گزاری ہے۔ اب بھی گو میں لاہور میں رہتا ہوں لیکن ایک بالکل طالب علمانہ زندگی رکھتا ہوں۔ بس مشکل یہ ہے کہ میری علمی زندگی کے تقاضے مجھے لاہور کے قیام پر مجبور کرتے ہیں اور معاشی ضروریات ٹبی بھیکو (مولانا کے گاؤں رحمان آباد کا پرانا نام۔ مدیر) سے باندھے ہوئے ہیں کشمکش یہ ہے کہ نہ پیٹ کو لپیٹ سکتا نہ روح کو کچل سکتا۔ اب دیکھئے رب کریم میرے لئے اس کشمکش سے عہدہ برآمد ہونے کی کیا راہ نکالتے ہیں۔'' (سہ ماہی تدبر، جولائی ۱۹۹۸ء، ص ۸۱)

لاہور سے ۲۳؍جنوری ۱۹۷۳ء کو بنام ڈاکٹر عبداللطیف خان لکھا:

''اب میں نے یہ ارادہ کیا ہے کہ لاہور چھوڑ کر ایک دیہات میں چلا جاؤں۔ وہاں میری بیوی کا ایک مختصر رقبہ زمین ہے۔ اس پر ایک جھونپڑا بنا کر بقیہ زندگی وہیں گزارنے اور جب تک قوت ساتھ دے تفسیر لکھنے کا ارادہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لاہور میں اب میری دلچسپی کی کوئی چیز نہیں رہی۔ ڈاکٹر اسرار صاحب کی معیت میں جو کام شروع کیا تھا اس کو انھوں نے بالکل تلپٹ کر کے اپنا ذاتی کام بنا لیا ہے اور نہ میں ان کو سمجھانے میں کامیاب ہو سکا اور نہ میرے دوسرے ثقہ اور ذی علم احباب اس میں کامیاب ہو سکے۔ اس وجہ سے ہم سب نے اس سے علیحدگی اختیار کر لی۔

میں لاہور میں اسی کام کی خاطر اٹکا ہوا تھا ورنہ یہاں کی کثیر المصارف زندگی میرے تحمل سے باہر تھی۔

چنانچہ میں قرض دار بھی ہو گیا۔ یہاں میری کوئی ذاتی آمدنی نہیں ہے۔ میری کتابیں بھی میرے لیے کسی دنیوی منفعت کا ذریعہ نہیں بنیں اور اب تو ڈاکٹر صاحب ان پر اس طرح مسلط ہونے کی کوشش کر رہے ہیں کہ مستقبل میں بھی ان سے مجھے کسی فائدے کی امید نہیں۔ میرا گزارہ یا تو زمین کی آمدنی سے ہو رہا تھا یا آپ مدد فرماتے تھے۔ زمین کی آمدنی بس اتنی ہے کہ زمین پر رہ کر تو اس سے روٹی کھا سکتا ہوں لیکن لاہور شہر کے مصارف اس سے پورے نہیں ہو سکتے۔ اس وجہ سے اب میرے لیے واحد راستہ یہی ہے کہ وہیں چلا جاؤں۔ وہاں امید ہے کہ تفسیر کا کام زیادہ اطمینان سے کر سکوں گا۔ یہاں بہت سا وقت لوگوں سے ملنے جلنے میں بھی صرف ہو جاتا ہے۔

میری کتابوں کے چھپنے کا معاملہ اب بالکل مجہول ہو گیا۔ میرے پاس ایسے ذرائع نہیں کہ میں ان کو چھپوا سکوں اور ڈاکٹر صاحب پر مجھے اعتماد نہیں رہا۔ اس وجہ سے اب اس معاملے کو خدا کے حوالے کرتا ہوں۔ اگر اس کی مرضی ہو گی تو ان کے چھپنے کی کوئی صورت پیدا ہو جائے گی ورنہ اپنے رب کے فیصلہ پر راضی ہوں۔ البتہ لکھنا میری ذمہ داری ہے اور یہ کام میں آخر دم تک ان شاء اللہ کرتا رہوں گا چونکہ آپ اس کام کے سب سے بڑے معاون اور قدر دان ہیں اس وجہ سے آپ کو آگاہ کرنا ضروری ہوا۔'' (سہ ماہی تدبر، جولائی ۱۹۹۸ء، ص ۸۰)

گاؤں میں قیام

بیگم امین احسن صاحبہ کی زمین ضلع شیخوپورہ کے قصبے خانقاہ ڈوگراں سے چند میل کے فاصلے پر ہے۔ گاؤں کی آبادی بہت مختصر تھی۔ امین احسن نے اس کا نام اپنے سسر کے حوالے سے رحمٰن آباد رکھا۔ گاؤں شہری سہولتوں سے بالکل محروم تھا۔ بجلی نہیں تھی۔ مکانات کچے تھے۔ گلیوں میں گائیں بھینسیں بندھی ہوتی تھیں۔ جگہ جگہ غلاظت کے ڈھیر پڑے ہوتے تھے۔ مکھیوں اور مچھروں کی بھرمار تھی۔ آبادی ان پڑھ تھی۔ امین احسن کی علمیت کی قدر کرنے والا کوئی نہ تھا۔ اس کے باوجود امین احسن کو دیہی زندگی سے بے حد انس تھا۔ انھوں نے زمینوں کی دیکھ بھال بڑی جاں فشانی سے کی۔ ان کا معمول یہ تھا کہ نماز فجر اور پھر نماز عصر کے بعد رقبے پر جاتے۔ کاشت کی نگرانی کرتے۔ کسانوں کو بر سر موقع ہدایات دیتے۔ ایک ایک بوٹے پر توجہ دیتے۔ نہری پانی ملنے کی باری اگر رات کے وقت ہوتی تو رات کو اٹھ کر رقبہ پر جاتے۔ گاؤں کی زمین کینو کے لیے موزوں پائی تو بڑے اہتمام سے کینو کے دو باغ لگوائے۔ یہ محنت اور منصوبہ بندی باثمر ہوئی۔ زمین کی آمدنی میں خاصا اضافہ ہو گیا۔

امین احسن رقبے پر آنے جانے سے تفسیری مشکلات حل کرنے کا کام بھی لیتے تھے۔ جو کچھ انھوں نے لکھنا ہوتا تھا، اس کا اسلوب متعین کرنے کے لیے وہ سیر کا وقت بڑا موزوں خیال کرتے تھے۔ سورۂ کہف میں ہے کہ ایک باغ والے کا باغ درختوں سے گھرا ہوا تھا اور بیچ بیچ میں کاشت کی جاتی تھی، امین احسن نے ایک ایسا ہی اپنا باغ بنایا۔ زمین کے ارد گرد شیشم کے درخت لگوائے، درمیان میں کینو کے پودے اور ان کے بیچ کی زمین میں کاشت کی جاتی تھی۔ امین احسن باغ میں داخل ہوتے تو پڑھتے 'ماشاء اللہ لا قوۃ إلا باللہ' (جو کچھ اللہ نے چاہا، عطا فرمایا، اللہ کے بغیر ہماری کوئی طاقت نہیں)۔ یوں اپنی عبودیت اور ممنونیت کا اقرار اور اظہار کرتے۔

گاؤں جانے کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ شہری مصروفیات سے چھٹکارہ مل گیا۔ تفسیر کا کام تیزی سے ہونے لگا۔ امین احسن نماز فجر کے بعد رقبے کا چکر لگا کر واپس آتے، ناشتہ کرتے اور گاؤں سے متصل واقع دیہی کونسل کی عمارت میں چلے جاتے۔ وہاں کسی شیشم کے درخت کے نیچے بیٹھ کر تفسیر لکھتے۔ یہ تفسیر اس غور و فکر کا نتیجہ ہوتی جو انھوں نے سحری کے وقت کیا ہوتا تھا۔ قیلولہ کے بعد اگلی آیات پر غور کرتے۔ عصر کی سیر کے دوران میں ان کے نکات پر غور کرتے۔ بعض اوقات آیات کا نظم یا کسی مضمون کو ادا کرنے کا اسلوب سمجھ میں نہ آتا تو کئی روز تک غور و فکر جاری رہتا اور لکھنے کی نوبت نہ آتی۔

حلقۂ تدبر قرآن کے رفقا مہینے میں ایک بار ضرور حاضر ہوتے۔ امین احسن اس دوران میں پیش آنے والی مشکلات کا تذکرہ کرتے۔ کوئی بات تحقیق طلب ہوتی تو خالد مسعود صاحب کو اس پر کام کرنے کی ہدایت کرتے۔ کئی بار ایسا بھی ہوتا کہ خالد صاحب کو اپنا نقطۂ نظر لکھ کر پیش کرنے کو کہتے۔ جب خالد صاحب اپنی سوچ کے مطابق تفسیر لکھ کر دیتے تو امین احسن خوش ہو کر کہتے کہ تم نے بات کو ٹھیک سمجھا، اس سے مسئلہ حل ہو گیا۔

امین احسن کی اسی زندگی کے بارے میں جاوید احمد صاحب غامدی لکھتے ہیں:

''یہ تفسیر لاہور میں بھی لکھی گئی اور برسوں لاہور سے باہر خانقاہ ڈوگراں کے پاس ایک دور افتادہ گاؤں رحمٰن آباد میں سر سے اور شیشم کے درختوں کے نیچے بھی زیر تسوید رہی، جہاں نہ بجلی تھی، نہ پنکھا اور نہ تصنیف و تالیف کے لیے کوئی دوسری سہولت۔ ہم نے بارہا دیکھا کہ مسودہ پسینے سے بھیگ رہا ہے، لیکن مصنف کا قلم اسی طرح رواں دواں ہے۔ وہ اس بات سے آگاہ تھے کہ —— بہر یک گل زحمتِ صد خار می باید کشید —— قرآن کی مشکلوں کو حل کرنے اور اس سے متعلق اپنے نتائج فکر کو سپرد قلم کرنے میں وہ دنیا کی ہر مشقت اٹھانے کے لیے تیار ہو جاتے تھے:

طالباں را خستگی در راہ نیست
عشق خود راہ ست و ہم خود منزل ست‘‘[1]

(ماہنامہ اشراق، جنوری/فروری ۱۹۹۸ء، ص ۱۴)

امین احسن کے شاگردوں کے علاوہ ان کے احباب اور بعض اہل علم بھی کبھی کبھار انھیں ملنے کے لیے گاؤں میں جایا کرتے تھے۔ خالد صاحب جب ملنے کے لیے جاتے تو امین احسن ایسے مہمانوں کا تذکرہ کرتے۔ امین احسن اکرام ضیف کے معاملے میں بہت حساس تھے۔ جب بھی کوئی مہمان آتا تو وہ بے حد خوش ہوتے اور تواضع میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے۔

امین احسن گاؤں کی مسجد میں جمعہ بھی پڑھاتے تھے۔ ان کا خطبہ مخاطبین کے عین مطابق ہوتا تھا۔ وہ کسانوں کو یہ پیغام دیتے کہ ان کے لیے اپنے رب کو یاد رکھنا بے حد آسان ہے، کیونکہ ایک کسان بیج ڈالنے سے لے کر فصل اٹھانے تک برابر اللہ تعالیٰ ہی سے امید رکھنے والا ہوتا ہے۔ اس لیے اگر کسان اس حقیقت کو فی الواقع دل میں جگہ دے لیں تو وہ اللہ کے ہاں بڑا مرتبہ پا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ امین احسن وہاں کے جھگڑے نمٹانے میں بھی دل چسپی لیتے تھے۔ وہ غریبوں کا بڑا ساتھ دیتے تھے۔

گاؤں میں امین احسن کیسے کیسے حالات سے گزرتے تھے، ان کے خطوط بیان کرتے ہیں۔ سردار محمد اجمل خان لغاری صاحب کے نام لکھتے ہیں:

’’ایک مربعہ کی خود کاشت شروع کرا دی ہے۔ پیش نظر یہ ہے کہ اپنی معاشی مشکلات میں کچھ سہولت کی راہ نکالوں۔ یہ سہولت تو جب پیدا ہو گی تب ہو گی، اور معلوم نہیں پیدا بھی ہو گی یا نہیں لیکن ایک نسیہ کے پیچھے خاصی نقد مشکلات میں اپنے آپ کو پھنسا لیا ہے۔ دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ اس مخمصہ سے نکالے اور اٹھایا ہوا قدم واپس نہ لینا پڑے۔ میری نیت بخیر ہے۔ چاہتا ہوں کہ دو روٹی آسانی سے ملتی رہے تاکہ میں اپنی تفسیر لکھ سکوں۔‘‘ (سہ ماہی تدبر، جولائی ۱۹۹۸ء، ص ۸۰)

سردار محمد اجمل خان لغاری صاحب کے نام ہی ایک اور خط:

’’میں کل رقبہ پر سے واپس آیا ہوں۔ وہاں مجھے ایک موقع دیکھنے کے لیے کھال (چھوٹی نہر کی شاخ جو کھیتوں میں پائی جاتی ہے) کی اونچی مینڈ پر سے گزرنا پڑا۔ راستہ بالکل ناہموار تھا۔ اس وجہ سے میرا جوتا

۱۔ ’’سچے طالبوں کو راہ میں تکان لاحق نہیں ہوتی، اس لیے کہ عشق راہ بھی ہے اور منزل بھی۔‘‘

پھسلا اور میں کھال کے اندر جا پڑا۔ میری بائیں کہنی کا جوڑ اپنی جگہ سے سرک گیا۔ جوڑ وہیں کے ایک آدمی نے بٹھایا لیکن شائد اچھی طرح بیٹھا نہیں۔ اس وجہ سے ابھی تکلیف دور نہیں ہوئی ہے۔ دعا فرمایئے کہ اللہ تعالیٰ اس تکلیف کو دور کرے اور اس کو گناہوں کا کفارہ بنائے۔''

(سہ ماہی تدبر، جولائی ۱۹۹۸ء، ص ۷۹)

رحمٰن آباد سے ۲۳ر مئی ۱۹۷۹ء کو بنام محمد احسن خان:

''اس میں شبہ نہیں کہ ان دنوں گندم کی صفائی ہو رہی ہے جس کی فکر ہمہ وقت ذہن پر سوار رہتی ہے لیکن اس کے باوجود ہو رہے ہیں تو خط بھی لکھا جا سکتا تھا۔ بہر حال اس کوتاہی کی معافی چاہتا ہوں۔

اس وقت میری مشکل بھی کچھ اسی طرح کی ہے جس سے آپ دوچار ہیں۔ انور صاحب سلمہٗ کو حکومت نے ژوب بھیج دیا۔ وہ قریب ہوتے تھے تو زمین داری کی ذمہ داریوں میں ان کی مدد آسانی سے حاصل ہو جاتی تھی۔ اب اس کا امکان نہیں رہا۔ اب عملی نہ سہی لیکن قانونی ذمہ داری تمام تر تنہا مجھ پر ہے۔ اہلیہ بوجہ علالت دو ہفتے سے لاہور میں ہیں۔ یہاں میں تنہا ہوں۔ منشی ہر مسئلہ میں میری رہنمائی چاہتا ہے اور میں فن زمین داری سے جتنا واقف ہوں آپ اس سے بے خبر نہیں ہیں۔ کتنی گندم رکھنی ہے؟ کتنی بیچنی ہے؟ کس کس کو کتنی دینی ہے؟ کون سی قسم کتنی بیج کے لیے محفوظ کی جائے گی؟ کون سی کھانے کے لیے رکھی جائے گی؟ ابھی ایک مائی بھوسے کی درخواست لے کر آئی تھی۔ نائن شاکی ہے کہ منشی نے اس کو گندم کم دی ہے۔ مزارعوں کا تقاضا ہے کہ ان کی گندم بھی میں اپنی مشین سے صاف کرا دوں۔ نوکروں کو اصرار ہے کہ اب ٹریکٹر خالی ہونا چاہیے تاکہ پنیری لگانے اور دھان کے لیے زمین تیار کرنے کا کام شروع ہو۔ وقت گزر رہا ہے۔

پاکستان کی زرعی ترقی کا حال یہ ہے کہ یہاں تھریشر کے جو پٹے بنتے ہیں، شائد کچے دھاگے یا مٹی سے بنتے ہیں کہ بلا مبالغہ تین دن میں اس کے پرزے اڑ جاتے ہیں۔ اور ان کی قیمت سینکڑوں روپے ہوتی ہے۔ پچھلے سال جو پٹہ خریدا وہ تین دن میں تار تار ہو گیا۔ اس سال نیا خریدا اس کا جو حشر ہوا اس کو کیا عرض کروں! کل بھاری قیمت ادا کر کے نیا پٹہ منگوایا ہے اس پر مہر تو انگلینڈ کی ہے لیکن اصل کیا ہے اس کا اندازہ تجربہ سے ہو گا۔ موسم کا حال یہ ہے کہ ہر روز کچھ چھینٹے پڑ جاتے ہیں جس سے صفائی کا کام ملتوی ہو جاتا ہے اور فکر بڑھ جاتی ہے۔''

(سہ ماہی تدبر، جولائی ۱۹۹۸ء، ص ۸۰)

صحافی اور کالم نگار عطاء الرحمٰن نے لکھا:

''۷۶۔۱۹۷۵ء میں مولانا اصلاحی تنگیِ حالات کا شکار ہو کر اور مقروض حالت میں لاہور سے ضلع شیخوپورہ

میں واقع اپنے گاؤں رحمٰن آباد میں منتقل ہونے پر مجبور ہو گئے۔ تب ان کی ایک آنکھ کا آپریشن ہو چکا تھا۔ گاؤں میں بجلی نہیں تھی۔ مولانا اصلاحی دن کا وقت کھیتی باڑی کے کاموں میں گزارتے اور شام کے دھندلکے میں لالٹین کی روشنی میں بیٹھ کر رات دیر گئے تک اپنی تفسیر مکمل کرنے میں مصروف رہتے۔ آپ اندازہ لگائیے کہ بیسویں صدی کے ربع آخر میں جب چند میل کے فاصلے پر دنیا بھر کی سہولتیں موجود تھیں قرآن مجید کا یہ بلند پایہ اسکالر خاموشی اور تنہائی کے عالم میں نامساعد معاشی حالات کی وجہ سے کمزور بصارت کے ساتھ لالٹین کی روشنی کی مدد سے آئندہ نسلوں کے لیے قرآن مجید کی ایک ایک آیت بلکہ ایک ایک لفظ پر اپنے عمر بھر کے فکر و تدبر کے نچوڑ کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنے میں مگن رہتا۔ یہ وہ دور تھا جب ہر وہ شخص جسے علامہ اقبال، مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی کی تحریریں پڑھ کر عہد حاضر کے اسلوب میں خطابت کا ملکہ حاصل ہو گیا تھا یا وہ چند قابل اشاعت سطریں لکھنے کے قابل ہو گیا، داعی انقلاب اسلامی بننے کے خواب دیکھ رہا تھا اور اس کے پاس چندوں کی ریل پیل تھی۔ وہ فراٹے بھرتی گاڑیوں سے لے کر ائیر کنڈیشنڈ کمروں تک کی سہولتوں سے متمتع ہو رہا تھا لیکن علومِ قرآنی کی غواصی کرنے والا یہ درویش صفت اسکالر بے نیازی کے ساتھ صدیوں پرانے ماحول میں بیٹھ کر اکیسویں صدی کے ذہنی معیارات سے مطابقت رکھنے والی تفسیر قرآن لکھتا رہا۔ ۱۹۷۷ میں برادرم ذوالقرنین اور میں مولانا سے ملنے کے لیے رحمٰن آباد گئے تو ان کے چہرے پر وہی رونق تھی اور آنکھوں میں وہی شوخی اور چمک۔... بہت محبت سے ملے۔ تواضع کی۔ کچھ دیر باتیں کرتے رہے اور پھر اپنے کھیتوں کی سیر کرانے کے لیے باہر لے گئے۔ ہم نے دو تین گھنٹے مولانا کے ساتھ گزارے۔ اس دوران میں انھوں نے ایک لفظ بھی اپنی تنگیِ حالات کے بارے میں نہ کہا۔ نہ اس ماحول کا ذکر کیا جس میں وہ بڑھاپے کے ماہ و سال گزارنے اور علمی و تحقیقی کام کرنے پر مجبور تھے۔ البتہ اس بات پر بہت مسرور اور مطمئن تھے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں اتنی مہلت دی ہے کہ وہ اپنی تفسیر مکمل کر سکیں اور استاد نے اس دنیا سے رخصت ہوتے وقت جو امانت ان کی سپرد کی تھی، اسے کتابی شکل میں منتقل کر سکیں۔'' (ماہنامہ اشراق، جنوری/فروری ۱۹۹۸ء، ص ۴۴)

لاہور واپسی

گاؤں میں امین احسن کی واحد پریشانی طبی سہولتوں کی کمی تھی۔ اصل میں ان کی اہلیہ محترمہ شوگر کی مریضہ تھیں۔ جب ان کی حالت خراب ہوتی تو امین احسن بہت پریشان ہو جاتے تھے۔ بالآخر یہی پریشانی انھیں ۸ برس بعد لاہور واپس لے آئی۔ ۱۹۷۹ء میں وہ لاہور منتقل ہو گئے۔

بیٹی کے گھر میں رہنا

لاہور آنے کے بعد امین احسن اپنی بیٹی محترمہ مریم صاحبہ کے گھر رہے۔ آپ کے داماد میجر محمد انور صاحب تھے۔ محترم جاوید احمد غامدی کے شاگرد اور خالد مسعود صاحب کے داماد نعیم احمد بلوچ صاحب بتاتے ہیں کہ میں اور محمد احسن تہامی صاحب یہاں جایا کرتے تھے۔ کبھی لان میں بیٹھ جایا کرتے تھے اور کبھی کمرے میں۔ ہماری چائے کے ساتھ تواضع ہوتی تھی اور چائے کے ساتھ ضرور کچھ نہ کچھ ہوتا تھا۔ پہلے ہم بے قاعدہ طریقے سے جاتے تھے، پھر ہم نے ایک دن طے کر لیا۔ اگرچہ ہم نے اس کا اعلان نہیں کیا تھا، اس کے باوجود مولانا کو ہمارا انتظار رہتا تھا۔ ایک دفعہ ہم نہیں گئے تو مولانا نے کسی سے کہا: وہ لوگ کہاں گئے؟ چڑیاں اڑ گئیں؟ ہمیں اس بات کا علم ہوا تو بڑا فخر محسوس ہوا۔ مولانا کہا کرتے تھے کہ میں اپنی بیٹی کے گھر رہتا ہوں۔ میں راجپوت ہوں۔ راجپوتوں کے ہاں یہ بڑی شرم کی بات ہے، لیکن یہ جاہلانہ بات ہے۔ مجھ پر اس کا کوئی اثر نہیں ہے۔ اس وقت مریم صاحبہ کا بیٹا اسکول میں پڑھتا تھا۔